

تفہیم القرآن

(۳۱)

التوبہ

(از وسط رکوع ۱۳ تا وسط رکوع ۱۴)

کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کینٹھیا بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسر پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔ پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے

لے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دینے تشریف لے جانے سے پہلے قبیلہ خزرج میں ایک شخص ابو عامر نامی تھا جو زمانہ جاہلیت میں عیسائی راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار علمائے اہل کتاب میں ہوتا تھا اور وہ جاہلیت کی وجہ سے اس کے علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس کی درویشی کا سکہ بھی دینے اور اس کے اطراف کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم دینے پہنچے تو اس کی شیخت وہاں خوب چل رہی تھی۔ مگر یہ علم اور یہ درویشی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کے بجائے اٹھی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن گئی اور اس حجاب کا نتیجہ ہوا کہ حضور کی تشریف آوری کے بعد وہ محض نعمت ایمان ہی سے محروم نہ رہا بلکہ آپ کو اپنی شیخت کا حریم اور اپنے کاروبار درویشی کا دشمن بھٹکے آپ کی اور آپ کے کام کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا۔ پہلے دو سال تک تو اسے یہ امید رہی کہ کفار قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹانے کے لیے کافی ثابت ہوگی۔ لیکن جنگ بدر میں جب قریش نے شکست فاش کھائی تو اسے یارائے ضبط نہ رہا۔ اسی سال وہ مدینہ سے نکل کھڑا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف تبلیغ شروع کر دی۔ جنگ اُحد بن لوگوں کی سسی سے برپا ہوئی ان میں یہ بھی شامل تھا اور کہا جاتا ہے کہ اُحد کے میدان جنگ میں اسی نے وہ گڑھے کھدوائے تھے جن میں سے ایک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم گرزنی ہوئے۔ پھر جنگ احزاب میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان کو چڑھالانے میں بھی اس کا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد جنگ حنین تک جتنی لڑائیاں مشرکین عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئیں ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سرگرم حامی رہا۔ آخر کار اسے اس بات سے ایسی ہو گئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی، اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رخ کیا تاکہ قیصر کو اس "خطرے" سے آگاہ کرے جو عرب سے سراٹھا رہا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب مدینہ میں (باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۹ پر)

اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات نگر پر اٹھائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) یہ اطلاعات ہمیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے اور اسی کی روک تھام کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تبوک کی مہم پر جانا پڑا۔ ابو عامر راہب کی ان تمام سرگرمیوں میں مدینہ کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ شریک سازش تھا اور اس آخری تجویز میں بھی یہ لوگ اس ہم نواز تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصر روم اور شمالی عرب کی عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کے اور ان منافقوں کے درمیان یہ قرارداد ہوئی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنالیں گے تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی علیحدہ جگہ بندی اس طرح کی جاسکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا ہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہ نہ کیا جاسکے، اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہو سکیں اور آئندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں بلکہ ابو عامر کے پاس سے جو بخت خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی غیر مشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھہر سکیں۔ یہ سچی وہ ناپاک سازش جس کے مطابق وہ مسجد تیار کی گئی جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں، ایک مسجد قباجو شہر کے مضافات میں تھی، دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور وہ زمانہ ایسی اٹھانہ مذہبیت کا تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجا ہے خود کار ثواب جو قطع نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خودہ مخواہ تفریق رونما ہو جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح جوڑ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی علیحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں۔ چنانچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اس تعمیر نو کی ضرورت پیش کی کہ بارش میں اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً ضعیفوں اور معذروں کو جو ان دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں پانچواں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے، لہذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لیے یہ ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ان پاکیزہ امدادوں کی نمائش کے ساتھ جب یہ مسجد تیار ہوئی تو یہ اشرازی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرمادیں۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ اس مہم سے واپس اگر دیکھوں گا، اس کے بعد آپ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے اور آپ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جگہ بندی اور سازش کرتے رہے، حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ اوپر درمیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہو اور ادھر یہ فروری عبید اللہ ابن ابی کے سر پر تاج شاہی رکھ دیں۔ لیکن تبوک میں جو معاشرتی آفتاں اس نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قریب ذی اودان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ نے ہی دقت چندا درمیوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا تاکہ آپ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے وہ اس مسجد تیار کو سمار کر دیں۔

(حواشی صفحہ ۱۷) ۱۷ متن میں لفظ "جر بن" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق عربی زبان میں کسی ندی یا دریا کے اس کنارے پر ہوتا ہے جس کے نیچے کی مٹی کو پانی نے کات کات کر بہا دیا ہو اور اوپر کا حصہ بے سمار کھڑا ہو۔ جو لوگ اپنے عمل کی بنیاد خدا سے بے خوفی اور اس کی رضا سے بے نیازی پر رکھتے ہیں ان کی تعمیر حیات کو یہاں اس عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایسے ایک کھوکھلے بے ثبات کنارہ دریا پر اٹھائی گئی ہو۔ یہ ایک بے نظیر تشبیہ ہے جس سے زیادہ بہتر طریقہ سے اس صورت حال کا نقشہ کشی نہیں کی جاسکتی۔ اس کی پوری معنویت ذہن نشین کرنے کے لیے یوں سمجھیے کہ یہی زندگی کی وہ ظاہری سطح جس پر یومین و منافقین، کافر، صالح، ناجور، غرض تمام انسان کام کرتے ہیں ان کی اس اوپری تہ کے مانند ہے جس پر دنیا میں ساری (باقی حاشیہ صفحہ ۸)

اور وہ اسے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جاگری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ بھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ تو اپنے اندر خود کوئی پائیداری نہیں رکھتی، بلکہ اس کی پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے ٹھوس زمیں موجود ہو۔ اگر کوئی ایسی جہنم کے نیچے کی زمین کسی چیز مثلاً دیہا کے پانی سے کٹ چکی ہو تو ہونا وقت انسان اس کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا کر اس پر اپنا مکان بنائے گا تو وہ اس کے مکان سمیت بے بیٹھے گی اور وہ نہ صرف خود ہلاک ہوگا بلکہ اس ناپائیدار بنیاد پر اعتماد کر کے اپنا جو کچھ سرمایہ زندگی وہ اس عمارت میں جمع کرے گا وہ بھی برباد ہو جائے گا۔ بالکل اسی مثال کے مطابق حیات دنیا کی وہ ظاہری سطح بھی جس پر ہم سب اپنے کارنامہ زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں، نیچے خود کوئی ثبات و قرار نہیں رکھتی بلکہ اس کی مضبوطی و پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے خدا کے خوف، اس کے حضور جو ادب ہی کے احساس اور اس کی مرضی کے اتباع کی ٹھوس چٹان موجود ہو۔ جو نادان آدمی محض حیات دنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کرتا ہے اور دنیا میں خدا سے بے خوف اور اس کی رضا سے پرہیزگار کام کرتا ہے وہ دراصل خود اپنی تعمیر زندگی کے نیچے سے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور اس کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ بنیادیں سطح جس پر اس نے اپنی عمر بسر کرنا شروع کی ہے ایک دن یکایک گر جائے اور اسے اس کے پورے سرمایہ سمیت لے بیٹھے۔

(حواشی صفحہ ۱۲) لے "سیدھی راہ" یعنی وہ راہ جس سے انسان باہر آتا اور حقیقی کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے۔

لے یعنی ان لوگوں نے منافقانہ کمزور دماغ کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر کے اپنے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایمان کی صلاحیت سے محروم کر لیا ہے اور بے ایمانی کا روگ اس طرح ان کے دلوں کے ریشے ریشے میں پروت ہو گیا ہے کہ جب تک ان کے دل باقی ہیں یہ روگ بھی ان میں موجود رہے گا۔ خدا سے کفر کرنے کے لیے جو شخص ملانیرت بنا دے یا اس کے دین سے لڑنے کے لیے کلمہ کھلا دے اور دوسرے تیار کرے اس کی ہدایت تو کسی نہ کسی وقت ممکن ہے، کیونکہ اس کے اندر استباز، اخلاص اور اخلاقی جرأت کا وہ جوہر تو بنیادی طور پر محفوظ رہتا ہے جو حق پرستی کے لیے بھی اسی طرح کام آسکتا ہے جس طرح باطل پرستی کے کام آتا ہے، لیکن جو بزدل، جھوٹا اور سکارا انسان کفر کے لیے مسجد بنا دے اور خدا کے دین سے لڑنے کے لیے خدا پرستی کا پر فریب لبادہ اوڑھے اس کی سیرت تو نفاق کی دیکھ کھا چکی ہوتی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہی کہاں باقی رہ سکتی ہے کہ مخلصانہ ایمان کا بوجھ سہار سکے۔

لے یہاں ایمان کے اس معاملے کو جو خدا اور بندے کے درمیان ملے جوتا ہے، بیچ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان محض ایک بوجھ نہیں ہے عقیدہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کے معاہدہ میں خدا کی طرف سے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں وہ اسے جنت عطا کرے گا۔ اس اہم معضون کے تقاضات کو بگھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس بیچ کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، اس کے لحاظ سے تو انسان کی جان و مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہی اس کا اور ان ساری چیزوں کا خالق ہے جو اس کے پاس ہیں اور وہی نے وہ سب کچھ اسے بخشا ہے جس پر وہ تصرف کر رہا ہے، لہذا اس حیثیت سے تو خرید و فروخت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، انسان کا اپنی جہت سے کہہ سکتا ہے کہ کوئی چیز خدا کی ملکیت سے خارج ہے کہ وہ اسے خریدے، لیکن ایک چیز انسان (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۰)

اور مارتے اور مرتے ہیں، ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تو راتہ و نعلیل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) کے اندر ایسی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کالیہ اس کے سوا کسی کو دیا ہے اور وہ ہے اس کا اختیار یعنی اس کا اپنے انتخاب و ارادہ میں آزاد ہونا (Free will & freedom of choice) اس اختیار کی بنا پر حقیقت نفس الامری تو نہیں بنتی مگر انسان کو اس امر کی خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے کہ جسے تو حقیقت کو تسلیم کرے ورنہ انکار کر لے۔ بالفاظ دیگر اس اختیار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان فی الحقیقت اپنے نفس کا اور اپنے ذہن و جسم کی قوتوں کا اور اپنی اقتدارات کا جسے دنیا میں حاصل ہیں، مالک ہو گیا ہے اور اسے یہ حق مل گیا ہے کہ ان چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ جسے اس امر کی آزادی دیدی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے کسی جبر کے بغیر وہ خود ہی اپنی ذات پر اور اپنی ہر چیز پر خدا کے حقوق مالک و تسلیم کرنا چاہے تو کرے ورنہ آپ ہی اپنا مالک بنے اور اپنے زعم میں یہ خیال کرے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے حدود اختیار میں اپنے حسب مشا تفرص کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بیچ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بیچ اس معنی میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے خدا سے خریدنا چاہتا ہے، بلکہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز خدا کی ہے اور جسے اس امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے، اور جس میں امین رہنے یا غائب بن جانے کی آزادی اس نے انسان کو دے رکھی ہے، اس کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو پر خدا و رغبت (مذکورہ عبوری) میری چیز کو میری ہی چیز مان لے اور زندگی بھر اس میں خود مختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کر اور خدا کی جو آزادی تجھے حاصل ہے اسے خود بخود دست بردار ہو جا، اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ عارضی زندگی میں اپنی خود مختاری کو اجرتی حاصل کر دے تو نہیں بلکہ میری عطا کردہ ہے میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں تجھے بعد کی جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان خدا کے ساتھ بیچ کا یہ معاملہ کرے وہ مومن ہے اور ایمان دراصل اسی بیچ ہی کا دوسرا نام ہے، اور جو شخص اس سے انکار کر دے، یا اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویہ اختیار کرے جو بیچ ذکر کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جاسکتا ہے، وہ کافر ہے اور اس بیچ ہی سے گریز کا اصطلاحی نام کفر ہے۔

بیچ کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس کے تفصیلات کا تجزیہ کیجیے :-

(۱) اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو رو بہت بڑی آزمائشوں میں ڈالا ہے۔ پہلی آزمائش اس امر کی کہ آزاد چھوڑ دیے جانے پر یہ اتنی شرافت دکھاتا ہے یا نہیں کہ مالک ہی کو مالک کہے اور ملک حراؤ و بناوت پر زنا تر آئے۔ دوسری آزمائش اس امر کی کہ یہ اپنے خدا پر زنا تھا و کرتا ہے یا نہیں کہ جو حکمت کج نقد نہیں مل رہی ہے بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں جس کے ادا کرنے کا خدا کی طرف سے وعدہ ہے اس کے عوض اپنی آج کی خود مختاری اور اس کے مزے بیچ دینے پر جو تکی راضی ہو جائے۔

(۲) دنیا میں جس فقہی قانون پر اسلامی سوسائٹی جتی ہے اس کی رو سے تو ایمان میں چند عقائد کے اقرار کا نام ہے جس کے بعد کوئی قاضی شرع کسی کے غیر مومن یا خارج از ملت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا جب تک اس امر کا کوئی تصریح ثبوت اسے ذمہ نہ مل جائے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا ہے۔ لیکن خدا کے ہاں جو ایمان مستتر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خیال اور عمل دونوں میں اپنی آزادی و خود مختاری کو خدا کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے حق میں اپنے اوقات و ملکیت سے کالیہ دست بردار ہو جائے۔ پس اگر کوئی شخص کلمہ اسلام کا اقرار کرتا ہو اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ احکام کا بھی پابند ہو لیکن اپنے جسم و جان کا اپنے دل و دماغ اور بدن کی قوتوں کا اپنے مال اور وسائل و ذرائع کا، اور اپنے قبضہ و اختیار کی ساری چیزوں کا مالک اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہو اور ان میں اپنے حسب مشا تفرص کرنے کی گناہی اپنے لیے محفوظ رکھتا ہو، تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں وہ مومن سمجھا جاتا ہے مگر خدا کے ہاں یقیناً وہ غیر مومن ہی قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کے ساتھ وہ بیچ کا معاملہ سرے سے کیا ہی نہیں ہے جو قرآن کی رو سے ایمان کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں خدا کی مرضی ہو وہاں جان و مال کہانے سے دریغ کرنا (باقی صفحہ ۲۱۴ پر)

اور قرآن میں ۱۱ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو۔ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سو سے پر جو تم نے خدا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) اور جہاں اس کی مرضی نہ ہو وہاں جان و مال کھانا، یہ دونوں طرز عمل ایسے ہیں جو اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ مدعی ایمان نے یا تو جان و مال کو خدا کے ہاتھ سپرد نہیں ہے یا بیع کا معاہدہ کر لینے کے بعد بھی وہ سچی ہوئی چیز کو دستور اپنی بھرا ہے۔

(۳) ایمان کی یہ حقیقت اسلامی رویہ زندگی اور کافرانہ رویہ زندگی کو شروع سے آخر تک بالکل ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مسلم جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان لایا ہو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی مرضی کا تابع بن کر کام کرے اور اس کے رویہ میں کسی جگہ بھی خود مختاری کا رنگ نہیں لے پاتا، آئیہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور خدا کے ساتھ اپنے معاہدہ بیع کو بھول کر کوئی خود مختار حرکت کرے۔ اس کی جگہ وہ اپنی ایمان سے کہتا ہے کہ یہ تو میری اپنی چیز ہے، کوئی طرز عمل و تدبیر کوئی طریقہ معیشت و معاشرت اور کوئی بین الاقوامی رویہ خدا کی مرضی اور اس کے قانون شریعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا، اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا پر اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے تائب ہو اسی وقت وہ آزاد ہو گا، وہ پھر زندگی کے رویہ کی طرف پلٹ آتا ہے، خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس و متعلقات نفس کے بارے میں خود پر فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا ذکر کریں، ہر حال ایک کافرانہ رویہ زندگی ہے خواہ اس پر چلنے والے لوگ مسلمان کے نام سے موسوم ہوں یا غیر مسلم کے نام سے۔

(۴) اس بیع کی رو سے خدا کی جس مرضی کا اتباع مومن پر لازم آتا ہے وہ اس کی اپنی تجویز کر دہ مرضی نہیں بلکہ وہ مرضی ہے جو خدا خود بتائے۔ اپنے آپ کسی چیز کو خدا کی مرضی ٹھہرا لینا اور اس کا اتباع کرنا خدا کی مرضی کا نہیں بلکہ اپنی ہی مرضی کا اتباع ہے اور یہ معاہدہ بیع کے قطعی خلاف ہے۔ خدا کے ساتھ اپنے معاہدہ بیع پر صرف وہی شخص اور وہی گروہ قائم سمجھا جائے گا جو اپنا پورا رویہ زندگی خدا کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی ہدایت سے اخذ کرتا ہو۔

یہ اس بیع کے تفصیلات ہیں، اور ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس خرید و فروخت کے معاملہ میں قیمت (یعنی جنت) کو جو بیع دنیوی زندگی کے خاتمہ پر کیوں موقوف کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اس اقرار کا معاوضہ نہیں ہے کہ "بائع نے اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا" بلکہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ "بائع اپنی دنیوی زندگی میں اس بیع پر جو خود مختار تصرفت چھوڑے اور خدا کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرے"، لہذا یہ فروخت مکمل ہی اس وقت ہو گی جب کہ بائع کی دنیوی زندگی ختم ہو جائے اور فی الواقع یہ ثابت ہو کہ اس نے معاہدہ بیع کرنے کے بعد سے اپنی دنیوی زندگی کے آخری لمحہ تک یہاں کی شرائط پوری کی ہیں، اس سے پہلے وہ اذرو سے انصاف قیمت پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

ان امور کی توضیح کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس سلسلہ بیان میں یہ مضمون کس مناسبت سے آیا ہے، اوپر سے جو سلسلہ تقریر چل رہا تھا اس میں ان لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے ایمان لے لیا، ان کا اقرار کیا تھا، اگر جب امتحان کا نازک موقع آیا تو ان میں سے بعض نے تہل کی بنا پر، بعض نے اخلاص کی کی کی وجہ سے، اور بعض نے قطعی منقہ کی راہ سے خدا اور اس کے دین کی خاطر اپنے وقت، اپنے مال، اپنے خاندان اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا، لہذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے رویہ پر تنقید کرنے کے بعد اب ان کو صحت صحت بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان بے قبول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے، صحت یہ مان لینے کا نام نہیں ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہے، بلکہ وہ اصل وہ اس امر کا اقرار ہے کہ خدا ہی تمہارے نفس اور تمہارے مال کا مالک ہے۔ پس یہ اقرار کرنے کے بعد اگر تم اس نفس و مال کو خدا کے حکم پر قربان کرنے سے بھی چراتے ہو اور اپنے نفس کی قوتوں کو نیز اپنے ذرائع کو اس کے منشاء کے خلاف استعمال کرتے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو۔ سچا اہل ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو واقعی اپنا نفس و مال خود کے ہاتھ بیچ چکے ہیں اور اسی کو ان چیزوں کا مالک سمجھتے ہیں، جہاں اس حکم پر تہلے وہ نہیں بے دریغ قربان کرتے ہیں، اور جہاں اس کا حکم نہیں ہوتا وہاں نفس کی طاقتوں کا کوئی اور فی ساجز اور مالی ذرائع کا کوئی ذرا سا حصہ بھی خرچ کرنے کیلئے یہ نہیں ہوتے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۱) ۱۱ اس امر پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں کہ جس دوسرے کامیابوں کو ذکر ہے وہ توراہ اور انجیل میں موجود ہیں، مگر جہاں تک (باقی صفحہ ۱۲ پر)

سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پٹھنے والے، اس کی بندگی بجالانے والے، اس کی تعریف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) انجیل کا تعلق ہے۔ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ جو انجیل اس وقت دنیا میں موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنی ہیں، مثلاً:

”ساوک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہی کی ہے“ (متی ۵: ۱۰)

”جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا“ (متی ۱۰: ۳۹)

”جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوئوں یا پاپوں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سونگے گا اور میری

زندگی کا وارث ہو گا“ (متی ۱۹: ۲۹-۳۰)

البتہ تورات جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون نہیں پایا جاتا اور یہی مضمون کیا، وہ تو حیات بعد الموت اور یوم الحساب اور آخری جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ ہمیشہ سے دین حق کا جزو لازمک رہا ہے۔ لیکن موجودہ تورات میں اگر مضمون کے نپالے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ واقعی توراہ اس سے خالی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہود اپنے زائد تنزل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوشحالی کے بھوکے ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنی اس کے سوا نہ رہے تھے کہ وہ اسی دنیا میں حاصل ہو۔ اسی لیے کتاب الہی میں بندگی و اطاعت کے بدلے جن انعامات کے وعدے ان سے کیے گئے تھے ان سب کو وہ دنیا ہی میں مانگا لے اور جنت کی ہر نعمت کو انہوں نے فلسطین کی سرزمین پر چسپاں کر دیا جس کے وہ امید دار تھے۔ مثال کے طور پر توراہ میں مندرجہ ذیل آیت پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے:-

”سن اے اسرائیل! خداؤد ہا ما خدا ایک ہی خداؤد ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداؤد

اپنے خدا سے محبت کر“ (اشناہ: ۵۰)

لیکن اس آیت کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اس ملک کے مالک ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، یعنی فلسطین۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ توراہ جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے وہ خاص کلام الہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام بھی خدا کے کلام کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے اور یہودیوں کی قریبی روایات ان کے نسلی تصعبات ان کے اولیام، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں، ان کی غلط فہمیوں، اور ان کے نفسی اجتادات کا ایک مستند حصہ ایک ہی سلسلہ و عبارت میں کلام الہی کے ساتھ کچھ اس طرح دل لیا گیا ہے کہ اکثر شتا آپرسل کلام کو ان زوائد سے نیز کرنا قطعاً غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۷) لہٰذا متن میں لفظ انامیون استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ تو یہ کرنے والے ہے۔ لیکن جس انداز کلام میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ تو یہ کہنا اہل ایمان کی مستقل صفات میں سے ہے، اس لیے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ تو یہ نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ تو یہ کرتے رہتے ہیں، اور تو یہ کہنے والے ہی کو کہنے یا پٹھنے کے ہیں، لہٰذا اس لفظ کی حقیقی روح ظاہر کرنے کے لیے ہم نے اس کا تفسیری ترجمہ یوں کیا ہے کہ تو اللہ کی طرف بار بار پٹھتے ہیں، یعنی اگرچہ اپنے پورے شعور و ارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے نفس و مال کی بیخ کا سادے کرتا ہے، لیکن چونکہ ظاہر حال کے لحاظ سے محسوس ہی ہوتا ہے کہ نفس اس کا اپنا ہے اور مال اس کا اپنا ہے، اور روایات کو اس نفس و مال کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے ایک اور محسوس نہیں بلکہ محض ایک اور مقول ہے، اس لیے مومن کی زندگی میں بار بار ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جبکہ وہ عارضی طور پر خدا کے ساتھ اپنے ساتھ بیخ کو بھول جاتا ہے اور اس سے غافل ہو کر کوئی خود غرضانہ طرز عمل اختیار کر بیٹھتا ہے۔ مگر ایک حقیقی مومن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس کی یاد آجائے بھول دور ہوتی ہے اور وہ اپنی خلعت سے چمکتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے عند کی خلاف ورزی کر رہا ہے (باقی صفحہ ۱۸ پر)

کے گن گانے والے اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے، اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خیر و فرخندگی کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں، اور اسے نبی ان مومنوں کو خوشخبری دینے پر۔

نبی کریم اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) اسے ندامت لاتی ہوتی ہے اور شرمندگی کے ساتھ وہ اپنے خدائی طرف پلٹتا ہے، معافی مانگتا ہے اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کرتا ہے۔ یہی ابراہیم کی توبہ اور یہی وہ راہ کہ خدا کی طرف پلٹنا اور ہر نفس کے بعد و فاداری کی راہ پر واپس آنا ہی ایمان کا دوام و ثبات کا ضامن ہے، اور نہ انسان جن بشری کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ان کی موجودگی میں توبہ بات اس کے بس میں نہیں ہے کہ خدا کے ہاتھ ایک ذرہ نفس و مال بچ دینے کے بعد ہمیشہ کامل شعوری حالت میں اس بچ کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے اور کسی وقت بھی خلعت و نسیان اس پر طاری نہ ہونے پائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ مومن کی تعریف میں یہ نہیں فرماتا کہ وہ بندگی کی راہ پر اگر کبھی اس کے پسند ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی قابل تعریف صفت یہ قرار دیتا ہے کہ وہ مسلسل پھیل کر بار بار اسی راہ کی طرف آتا ہے، اور یہی توبہ ہے جس پر انسان قادر ہے۔

پھر اس موت پر مومنین کی صفات میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر کرنے کی ایک اور مصلحت بھی ہے۔ اوپر سے جو سلسلہ کلام چلا آ رہا ہے اس میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جن سے ایمان کے سنی، افغانی کا طور ہوا تھا، لہذا ان کو ایمان کی حقیقت اور اس کا بنیادی معنی بتانے کے بعد اب یہ تعین جاری ہے کہ ایمان لانے والوں میں لازمی طور پر جو صفات ہونی چاہئیں ان میں سے اولین صفت یہ ہے کہ جب بھی ان کا قدم راہ بندگی سے پھیل جائے وہ فوراً اس کی طرف پلٹ آئیں، نہ یہ کہ اپنے نحر پر بے رہیں اور زیادہ دور نکلنے پھلے جائیں۔

(حواشی صفحہ ۲۷) ۱۷۰ تن میں لفظ السائحون استعمال ہوا ہے جس کی تفسیر بعض مفسرین نے الصائمون (روزہ رکھنے والے) سے کی ہے، لیکن سیاحت کے معنی روزہ، عجاظی معنی ہیں، اصل لغت میں اس کے معنی نہیں ہیں، اور جب حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لفظ کے یہ معنی ارشاد فرمائے ہیں اس کی نسبت صحیح کی طرف درست نہیں ہے، اس لیے ہم اس لفظ کو اصل معنی میں ہی لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔ پھر جس طرح قرآن میں بکثرت مواقع پر مطلقاً اتفاق کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی خرچ کرنے کے ہیں اور مراد اس سے راہ خدا میں خرچ کرنا ہے، اسی طرح یہاں بھی سیاحت مراد لھن گھومنا پھرنا نہیں ہے، بلکہ ایسے مقامات کیے زمین میں نقل و حرکت کرنا ہے جہاں کہ اور بندہ ہوں اور جن میں اللہ کی رضا مطلوب ہو، مثلاً اقامت دین کے لیے جہاد، کفر زدہ علاقوں سے ہجرت، دعوت دین، اصلاح خلق، طلب علم صالح، مشاہدہ

آئندگی اور تلاش رزق حلال، اس صفت کو یہاں مومنین کی صفات میں خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود جہاد کی پکار پر گھروں سے نہیں نکلے تھے ان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ حقیقی حوزہ ایمان کا دعویٰ کر کے اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں رہ جاتا بلکہ وہ خدا کے دین کو قبول کرنے کے بعد اس کا بول بالا کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اسے قلعہ پرے کرنے کیلئے دنیا میں ڈیرہ دھوپ اور سکی رجم کرتا پھرتا ہے۔ ۱۷۱ یعنی اللہ تعالیٰ نے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت اور اصلاح

وجہ کے مسائل میں جو حدیں مقرر کر دی ہیں وہ ان کو پوری پابندی کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں، اپنے انفرادی و اجتماعی عمل کو انہی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں، اور کبھی ان سے تجاوز کر کے ذوق مافی کار و دنیاں کرنے لگتے ہیں اور نہ خدائی قوانین کے پیمانے خود ساختہ قوانین یا انسانی ساختہ کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں، اس کے علاوہ خدا کے حدود کی حفاظت میں یہ مہم بھی شامل ہے کہ ان حدود کو قائم کیا جائے، انھیں ٹوٹنے نہ دیا جائے، لہذا پہلے ایمان کی تعریف صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ خود حدود اللہ کی پابندی کرتے ہیں بلکہ زیادہ ان کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی کسبانی کرتے ہیں اور اپنا پروردگار اس کی میں لگا دیتے ہیں کہ حدیں ٹوٹنے نہ پائیں۔

۱۷۲ کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنی رکھتی ہے کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمہ دلی رحمت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اس کے تصور کو قابل معافی (باقی صفحہ ۲۸)

وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ کی تھا، مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا، حتیٰ کہ ابراہیمؑ بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) بگھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گناہ گار ہو، لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مستحبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم شخص اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا قتل خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کر لے اور ہمارے رشتہ دار کو تو ضرور بخش دے تو اسے اسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے جرموں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اس ایمان کے معنی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یونسؑ کو شکر کی یہ مغفرت کی دعا کرنا بلکہ یونسؑ کو فرمایا ہے کہ تمہارے لیے یہ زیادتی نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو، یعنی ہمارے معنی کرنے سے اگر تم باز رہے تو کچھ بات تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہوتی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور کچھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی منوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملہ میں داخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دنیوی تعلقات میں صلاحی، مواساتہ، اور رحمت و شفقت کا رتاؤ، تو یہ منوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دنیوی حقوق ضرور ادا کیے جائیں گے، حیثیت بڑی انسان کی ہر حال میں ادا کی جائے گی، حاجت منہ آدمی کو ہر صورت سہارا دیا جائے گا، بیماری اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر ٹھانڈی رکھی جائے گی، جہنم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا، اور ایسے معاملات میں ہرگز یہ تیار نہ کیا جائے گا کہ کون کون کسلم ہے اور کون غیر کسلم۔

(حواشی صفحہ ۱۲) اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اپنے مشرک، باپ کے تعلقات منقطع کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ نے نبی تھی کہ سَلِّمْ عَلَيْنَا سَلَامًا مُسْتَعْفِرًا لَدُنَّ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيظًا (مریم - ۳) "آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب کے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ وہ میرے اور بنائیت ہر مان ہے۔" اور لَا سَتَعْفِرُنَّ ذُنُوبَكُمْ وَلَا أُمَّتِي أَعْتَابًا إِنَّكُمْ كُنْتُمْ عَادِلِينَ (النساء - ۱۸) "میں آپ کے لیے معافی ضرور چاہوں گا، اور میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے کہ آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچاؤں، چنانچہ اسی وعدے کی بنا پر انجیل اپنے باپ کے لیے یہ دعا مانگی تھی کہ: وَاعْفِرْ لِي ذُنُوبِيَ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ وَلَا تَجْعَلْنِي يَوْمَ يُنْفَخُ السُّيُوفُ يَوْمَ لَا يُنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ مَّسْلُومٍ (الشعراء - ۵) "اور میرے باپ کو معاف کر دے، بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے تھا، اور اس دن مجھے رسوا کر جبکہ سب انسان اٹھ جائیں گے جبکہ مال کسی کے کچھ کام آئے گا نہ اولاد، نجات صرف وہ پاسے گا جو اپنے خدا کے حضور بناوٹ سے پاک دل لے کر حاضر ہوا ہو۔" یہ دعا اول تو خود آنتہائی تمنا ہے جس میں تھی مگر اس بعد جب حضرت ابراہیمؑ کی نظر اس طرف گئی کہ میں جس شخص کے لیے دعا کر رہا ہوں وہ تو خدا کا کلمہ کھلا باغی تھا اور اس کے لیے سخت دشمنی رکھتا تھا تو وہ اس کے بھی باپ آگے اور ایک بچے وفاداروں کی طرح انھوں نے باغی کی ہمدردی سے صاف صاف تبری کر دی، اگرچہ وہ باغی ان کا باپ تھا جس نے کبھی محبت سے ان کو بلا پوسا تھا۔

لے تن میں اتواہ اور عظیم کے الفاظ استعمال ہونے میں اتواہ کے معنی ہیں بہت آہیں بھرنے والا، زاری کرنے والا، ڈرنے والا، حسرت کرنے والا۔ اور عظیم اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مزاج پر قابو رکھتا ہو، غصے اور دشمنی اور مخالفت میں آپ سے باہر ہو، نہ محبت اور دوستی اور غلظت خاطر میں ہمدردی سے تجاوز کر جائے۔ یہ دونوں لفظ اس مقام پر دوسرے معنی دے رہے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے دعا سے مغفرت کی کیونکہ وہ بنائیت رقیق القلب آدمی تھے، اس خیال سے کہ باپ اٹھے تھے کہ میرا باپ جہنم کا اندھن بن جائے گا، اور عظیم تھے، اس ظلم کو تم کے باوجود جو ان کے باپ نے (باقی صفحہ ۱۳ پر)

اشد کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے جب تک کہ انہیں صاف صاف بتا دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا چاہیے، درحقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں آسمان و زمین کی سلطنت ہے، اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے، اور تمہارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمہیں اس سے بچا سکے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵) اسلام سے ان کو روکنے کے لیے ان پر ڈھانے تھے ان کی زبان اس کے حق میں دعا ہی کے لیے کھلی۔ پھر انہوں نے یہ دیکھ کر ان کا باپ خدا کا دشمن ہے اس سے تبرہ کی، کیونکہ وہ خدا سے ڈرنے والے انسان تھے اور کسی کی محبت میں حد سے تجاوز کر جانے والے نہ تھے۔ (حاشیہ صفحہ ۱۱۶) یعنی اللہ پہلے یہ بتا دیتا ہے کہ لوگوں کو کن خیالات، کن اعمال اور کن طریقوں سے بچنا چاہیے۔ پھر جب وہ نہیں باز آتے اور غلط فکری و غلط کاری ہی پر اصرار کیے چھے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی ہدایت و رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اس غلط راہ پر انہیں دھکیل دیتا ہے جس پر وہ خود جانا چاہتے ہیں۔

یہ ارشاد ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتا ہے جس سے قرآن مجید کے وہ تمام مقامات اچھی طرح سمجھے جاسکتے ہیں جہاں ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل بتایا ہے۔ خدا کا ہدایت دینا یہ ہے کہ وہ صحیح طریق فکر و عمل اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعے لوگوں کے سامنے واضح طور پر پیش کر دیتا ہے۔ پھر جو لوگ اس طریقہ پر خود چلنے کے لیے آمادہ ہوں انہیں اس کی توفیق بخشتا ہے۔ اور خدا کا گمراہی میں ڈالنا یہ ہے کہ جو صحیح طریق فکر و عمل اس نے بتا دیا ہے اگر اس کے خلاف چلنے ہی پر کوئی اصرار کرے اور سیدھا نہ چلنا چاہے تو خدا اس کو ذرہ بستی راست ہی اور راست رو نہیں بناتا بلکہ جہرہ خود جانا چاہتا ہے اسی طرف اس کو جانے کی توفیق دے دیتا ہے۔

اس خاص سلسلہ کلام میں یہ بات جس مناسبت سے بیان ہوئی ہے وہ پھیلی تقریر اور بعد کی تقریر پر غور کرنے سے باسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی تشبیہ ہے جو نہایت موزوں و درجہ سے پھیلے بیان کا خاتمہ بھی قرار پا سکتی ہے اور آگے جو بیان آ رہا ہے اس کی تشبیہ بھی۔

ایک گزارش

خریدار حضرات جب بھی خط و کتابت کریں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ حوالہ نہ دینے کی صورت میں تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی۔

”مینجر“